تعارفِ مقصد

قوانین فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ ہوا آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہیگی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہوجانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رو رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالیگا، جل جائیگا۔ جو زہر کھائیگا مرجائیگا۔ جو غذا کھائیگا، قوت اور نشوونما پائیگا۔ فطرت کے حدود فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اُسی فطرت کا ایک رخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرت کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہوجائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہیگا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت

دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کریگا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا کہ اسکا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کریگا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائیگا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اسکو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی پروازِ فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مقید ہو۔ یہ تو درحقیقت ربُّ العٰلمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے اور رب العٰلمین وہ ہے جسکی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اسکو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اسلیے وہ دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ان کی کامیابی مدنظر رکھی گئی

ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ اُن کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کریگا، فلاح پائیگا، خواہ وہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کریگا، نقصان اٹھائیگا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیر کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر ایمان لائے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اسلیے یہی ہماری تمام کوششوں کا مقصدِ اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکّن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی "قوم" میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے وہ مسلمانوں کی حکومت" انکا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئیرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتہً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے دائرۂ اسلام میں داخل ہیں، اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو انکی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائیگی کہ اتفاق سے حکمراں کلمہ گو ہیں، مگر

ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہوسکیگا۔ حاشا وکلا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسند حکومت پر قبضہ کرکے زمین کی دولت اور فرمانروائی کے تکبر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کرلیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیرائیگا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

"آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں"

درحقیقت جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے، اُسی اسلام کی جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور اُن پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفا اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جنکے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہوجائیں تو اسلام میں انکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہوجائے تو اسکے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ

نظام تمدن کو اُن اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسکے پاس آخر وجوہ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اسکے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائیٹی کے ساتھ اسکی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حصۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حُبِ انسانیت یا حُبِ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ انکی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوشحالی مضمر دیکھتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جنکو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلاف حُبِ وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ خلاف حُبِ وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ موجب فلاح سمجھتا ہو اسکو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسی برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیرِ نو (Social reconstruction)

مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ اُنکے ایمان و اعتقاد کا مقتضیٰ یہی ہے؟ کیا انکے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حُبِّ وطن یا خلاف حُبِّ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا انکے حق میں یہ راستبازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسکو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کرلیں جو انکے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوام عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راستباز اشتراکی سے آزادی اور وطنی عزت کے نام پر یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اس طریقہ کو قبول کرلیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سُن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اسکی اعتقادی اساس، اسکے نظریۂ حیات، اسکے اصول اخلاق، اسکے نظام تمدن، اسکے قوانین معاشرت و معیشت، اسکے آئینِ سیاست و طرزِ حکومت، غرض اسکی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو بھی کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعہ اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اسکے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of personality) کا پورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل

Social justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد Capacity کے مطابق اخلاقی روحانی اور مادّی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راستبازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت پر میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح "مذہبیت" کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اُسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی

طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیات قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے روشناس کیا جسکی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس میں درحقیقت ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جسکے متعلق میرے دل اور دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اسکے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اُس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف اور عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جسکی

وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ Domination کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے نہیں بچ سکتی کہ یہ حوصلہ مند Ambitious قوم اب اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ انکے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلت تعداد کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستہ میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اسکو محض اسکے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر انکے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر "اسلام ازم" کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اب اس جمہوری دور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑیگا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی ہی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہرحال موانع سے لبریز رہتی ہے

محض صبر، لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائینگے کہ اسلام کسی نسل یا قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح تمہاری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملیگی، تقدم اور شرف تمکو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہوگے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائینگے۔ یہاں برہمنیت یا نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ اسلام کی نوعیت اچھوت ادھار کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کی ووٹ بڑھانے کے لیے اُسکی جُز بنائی جائے مگر زندگی کی متاع میں اسکو برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ اپنے اوصاف ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اسکے نسب یا اسکے پیشے یا اسکی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اڑنے کی طاقت رکھتے ہو اڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کی ایک تحریک ہے، اسکو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے

کونسا موقع ہے؟

جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں انکی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کا غائر مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اسلیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے ۱۳ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کی حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا ــــ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ــــ حالانکہ اگر ایک سلیم الفطرت آدمی اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانے کی مذہبی تحریک نہیں ہے جسکی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اسکی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہر حال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفانِ نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں اور وہی ۳۰۰۰ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہونگے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق

(Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظام اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے